بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

دورِ جدید میں سائنس کی ترقی سے انسانیت کو جو مختلف قسم کے نقصانات پہنچے ہیں اُن میں فکری اور نظری اعتبار سے دو نقصانات بڑے تباہ کُن ثابت ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے انسان کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو بڑا محدود کر دیا ہے اور دوسرے اس سے انسان کے اندر ایک بر خود غلط قسم کا اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔

سائنس گزیدہ انسان اب جب کبھی کسی مسئلہ پر گفتگو کرتا ہے یا اُس کے روشن اور تاریک پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے تو وہ محض اُس کے حسّی اور مادّی پہلو نگاہ میں رکھتا ہے اور اس حقیقت پر کبھی غور کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا کہ اُس مسئلہ کے مادّی پہلوؤں کے علاوہ اس کے بیشمار اخلاقی اور روحانی پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ ہر معاملہ کو علت و معلول کی محسوس و مشہود کڑیوں میں جوڑ کر دیکھتا ہے کہ اس کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے انسانیت کو کونسے مادّی فوائد حاصل ہونگے اور عدمِ تکمیل کی صورت میں اس سے کس نوعیت کے مادّی نقصانات پہنچیں گے اور یہی اُس کے فکر کی انتہا اور اُس کی نظر کی آخری پرواز ہے۔

سائنس پرستوں کے اس گمراہ کُن طرزِ استدلال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ انسان بھی چند مادّی عناصر کے ظہورِ ترتیب کا فطری نتیجہ ہے۔ اُس کے وجود کا تانا بانا صرف کاربن، کیلشیم، لوہے، گندھک اور اسی قسم کی چند دھاتوں سے تیار ہوا ہے۔ اس لیے وہ بھی لوہے کی مشینوں کی طرح صرف ایک اعلیٰ درجہ کی پیچیدہ اور دلچسپ مشین ہے جسے فطرت نے پیدا کیا ہے۔ آگہی، شعور، وقوف، قلب، ضمیر، وجدان یہ سب چیزیں بھی مادہ ہی کی ترقی یافتہ

صورتیں ہیں اور اس وجہ سے علت و معلول کے مادی قوانین کی ہی پابند ہیں۔ حیاتِ انسانی کے صرف مادی پہلو کے علاوہ اُس کا کوئی دوسرا پہلو تصور کرنا ہی کم عقلی اور حماقت کی دلیل ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیے کہ جدید انسان کا ذہن اعداد و شمار، تجربات و مشاہدات کے طلسم ہوشربا میں اس طرح اُلجھ کر رہ گیا ہے ——— کہ اُس کی نظر سے انسانیت کے لطیف احساسات، پاکیزہ جذبات، اور اعلیٰ اخلاق کے سارے پہلو اوجھل ہو گئے ہیں اور سائنس سے انسانیت نے اُس قدر بھی فائدہ نہیں اٹھایا جو اس سے فی الواقع اٹھایا جا سکتا تھا۔

یہ وہ بدیہی حقائق ہیں جنہیں مشرق کی مذہب پرست اقوام ہی تسلیم نہیں کرتیں بلکہ جن کا خود مغرب کے بعض نہایت اونچے اور ذہین انسانوں نے بڑے واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلی شہادت مشہور سائنس دان الیکس کیرل کی نقل کرتے ہیں۔ یہ ذہین انسان کئی برس تک راک فیلر انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ریسرچ کے شعبۂ تحقیق میں کام کرتا رہا۔ اس اثنا میں جب اس نے سائنس کے مختلف شعبوں کا مطالعہ کیا تو اسے اس امر کا شدت سے احساس ہُوا کہ تہذیبِ جدید کی تعمیر میں سائنس کے جن اصولوں سے کام لیا گیا ہے وہ بڑے ناقص ہیں اس وجہ سے اس تہذیب میں بھی کئی قسم کے اسقام موجود ہیں جو انسانیت کی صحیح اور متوازن نشوونما کے راستے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اس سقم کی بنیادی وجہ الیکس کیرل کے نزدیک یہ ہے کہ سائنس کے وہ اصول جن کا تعلق بے جان مادہ سے ہے، انہیں سائنس پر بے جا اعتماد کی وجہ سے، ذی روح اور باشعور انسانوں کے تہذیبی، معاشرتی اور روحانی مسائل کو حل کرنے کے لیے بھی اندھا دھند استعمال کیا جا رہا ہے۔ انسانی زندگی بڑی پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہے۔ اس کی گہرائی کی کوئی انتہا نہیں۔ اور اس کی وسعت کا بھی ٹھیک اندازہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے جو لوگ بھی حیاتِ انسانی کو مجرد سائنس کے اصولوں سے حل کرنے کی کوشش کریں گے وہ ہمیشہ

انسانیت کو غلط اور تباہ کُن راستوں پر دھکیل دیں گے۔ برق و باراں کے مشاہدات سے، یا خلا میں سفر کرنے سے، یا ایٹم کے تجربات سے من کی دنیا کے رازہائے سربستہ معلوم نہیں کیے جاسکتے اِس دنیا کے اپنے اصول اور ضابطے ہیں، یہاں تحقیق و جستجو کے کچھ دوسرے قوانین ہیں، یہاں پیمائش کے کچھ الگ پیمانے ہیں۔ اِس دنیا کا مسافر سفر کرنے کے لیے جس نوعیت کا زادِ راہ فراہم کرتا ہے وہ اُس سے مختلف ہوتا ہے جو چاند کی طرف پرواز کرنے والے اپنے لیے آج بالعموم مہیا کر رہے ہیں۔ خلا میں اڑنے والے اپنے سفر کا آغاز اپنے آپ پر اور اپنے وسائل پر بے جا اعتمادی سے شروع کرتے ہیں اور چند ہزار میل کا سفر طے کرنے کے بعد، جس کی حیثیت اس وسیع و عریض کائنات میں ذرّہ کے برابر بھی نہیں۔ کم ظرفوں کی طرح پکار اٹھتے ہیں۔ "انہیں خداوند تعالیٰ کا کہیں نشان نہیں ملا"۔ عقل کے یہ اندھے خلا میں اڑتے ہوئے زمین کے چاروں طرف نیلگوں ہالہ دیکھتے ہیں، روشنی سے تاریکی اور تاریکی سے روشنی میں جانے کے کئی مراحل طے کرتے ہیں کبھی کبھی دنیا کو اپنے سروں پر لٹکتا ہوا پاتے ہیں اور یہ سوچنے بھی لگتے ہیں کہ آخر یہ کس چیز کے سہارے معلق ہے[1]۔ لیکن قدرت کے ان مختلف مناظر کی حسن و دلکشی، صنعت گری، پختہ کاری اور حیرت انگیزی کے ثبوت پر ثبوت ملنے کے باوجود وہ خالقِ کائنات کے ادراک سے عاجز ہی رہتے ہیں۔ ان کور چشموں کے برعکس من کی دنیا کے مسافر کائنات کے ہر ذرّہ کو، اپنے جسم کی ساخت کو وجودِ باری تعالیٰ پر قوی شہادت سمجھتے ہیں اور انہیں جب کبھی قلب و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے تو انہیں جہاں ایک طرف اپنی بے بسی، عجز اور درماندگی کا اعتراف ہوتا ہے وہاں ایک "دیکھے بھالے، بن سوجھے، جانے پہچانے، بن بوجھے" قادرِ مطلق کے وجود کا بھی احساس ہوتا ہے۔

اپنے حدود کا صحیح احساس اور اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کی وسعت کا ٹھیک اندازہ

---

[1] یہ اُس روسی کے تاثرات ہیں جس نے پچھلے دنوں خلا میں پرواز کی گئی۔

ہی ایک انسان یا قوم کو حق کے راستے پر گامزن کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی حیثیت اس وسیع کائنات میں اتنی بھی نہیں جتنی کہ پانی کے ایک قطرہ کی سمندر میں ہوتی ہے۔ پھر خود انسانی زندگی کے بےشمار کرشمے ایسے ہیں جن کا مجرد عقل احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس چھوٹے سے حیرت انگیز کارخانہ میں اتنے لاتعداد عوامل کام کرتے ہیں کہ ان کا جاننا یکسر ناممکن ہے۔ انسان اگر ایک طرف شعور کے تحت سرگرمِ عمل ہوتا ہے تو دوسری طرف ان گنت غیر شعوری اور لاشعوری عناصر اُس کی زندگی میں ہر وقت کارفرما رہتے ہیں۔ اِن حالات میں یہ دعویٰ کرنا کہ سائنس کے اصول ہمہ گیر ہیں اور وہ انسانیت کے ہر مسئلہ کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کر سکتے ہیں ایک احمقانہ جسارت ہے۔ اسی جسارت پر الیکس کیرل اور اُسکی طرز پر سوچنے والے دوسرے مفکرین نے واشگاف الفاظ میں گرفت کی ہے۔ چنانچہ الیکس کیرل اسی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"وہ علوم جن کا تعلق بے جان مادے سے ہے، اور جو انسانی زندگی سے بحث کرتے ہیں اُن کے درمیان عجیب و غریب تفاوت پایا جاتا ہے . . . ذی روح مخلوق کا علم خصوصاً انسان کے بارے میں جو معلومات ہمیں آج تک حاصل ہوئی ہیں ان میں نمایاں ترقی نہیں ہوئی۔ یہ علم ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے۔ انسان انتہائی پیچیدہ مشین ہے اس لیے اُس کی زندگی کی کوئی آسان اور سادہ تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ کوئی ایک طریقہ ابھی تک انسان نے ایسا دریافت نہیں کیا جس کی مدد سے پوری انسانی زندگی، یعنی اُس کے مختلف شعبوں اور اُن کے باہمی زندگی سے تعلق کو کماحقہٗ سمجھا جا سکے . . . ہماری جہالت بلاشبہ بہت زیادہ اور افسوسناک ہے۔ تہذیبِ جدید اب دورِ ابتلا سے گزر رہی ہے، یہ ہمارے مسائل کو حل کرنے سے عاجز ہے اِس کی تعمیر نوعِ بشری کے متعلق صحیح علم کے مطابق نہیں کی گئی بلکہ اسے سائنس والوں کے اوہام نے جنہیں وہ اپنے انکشافات سمجھ بیٹھے ہیں، عام انسانوں کی حیوانی خواہشات نے اور غلط تصورات نے جنم دیا ہے۔ ہم خود اس تہذیب کے معمار ہیں لیکن یہ ہمارے مناسب

حال نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

ہمارے علوم کا مرکز و محور انسان ہونا چاہیے۔ لیکن انسان ہی آج کل اس دنیا میں سب سے زیادہ اجنبی بن کر رہ گیا ہے۔ وہ دنیا کے معاملات کو احسن طریق سے حل کرنے میں سخت ناکام رہا ہے کیونکہ وہ اپنی فطرت سے ناآشنا ہے بے جان مادہ سے تعلق رکھنے والے علوم نے اس دور میں ذی روح انسانوں سے بحث کرنے والے علوم پر حیرت انگیز سبقت حاصل کر لی ہے اور یہی انسانیت کا سب سے بڑا زیاں ہے۔"

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فاضل مصنف نے اس حقیقت کو بھی بڑی عمدگی سے بے نقاب کیا ہے کہ تہذیب جدید نے انسان کے نقطۂ نظر کو بڑا محدود بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ زندگی کے صرف ایک پہلو کا بھی پوری طرح جائزہ نہیں لے سکتا لیکن اس زعم میں گرفتار ہے کہ اس کا علم زندگی کی ساری وسعتوں پر محیط ہے۔ اسی سلسلہ میں الیکس کیرل لکھتا ہے:

"ہم بسا اوقات بعض اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر کے بعض کو غیر معمولی اہمیت دے بیٹھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ہر ماہر فن، اپنے فن سے غیر معمولی لگاؤ اور دوسرے علوم و فنون کے بارے میں بے جا تعصب کی بنا پر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں کا پوری طرح ادراک کر لیا ہے، درآنحالیکہ اس نے اس مسئلہ کے صرف ایک پہلو کو نگاہ میں رکھا ہوتا ہے اور اس طرح ایک ناقابلِ التفات "جزو" کو غلطی سے "کل" کے برابر فرض کر لیا جاتا ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ اجزا بھی کسی ترتیب سے منتخب نہیں کیے جاتے بلکہ لوگ بغیر کسی نظم کے وقتی جوش سے متاثر ہو کر انہیں بے سوچے سمجھے چن لیتے ہیں اور اس طرح باقی پہلو نظروں سے خود بخود اوجھل ہو جاتے ہیں۔

آپ دورِ جدید میں کسی مسئلہ کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے حل کرنے میں

اہلِ مغرب نے بھی دو بنیادی لغزشیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے ہر معاملہ کو صرف مادی منفعت کے معیار پر پرکھ کر اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر کوئی کام مادی اعتبار سے انہیں نافع اور سود مند نظر آیا تو اُسے فوراً اختیار کر لیا اور اگر انہیں وہ اس نقطۂ نظر سے ناپسندیدہ معلوم ہوا، خواہ وہ دوسرے پہلوؤں سے کتنا ہی مفید اور کارآمد ہو، تو اُسے فوراً ترک کر دینے کا مشورہ دیا۔ پھر انہیں "ترک و اختیار" کے اس غلط معیار پر اتنا غیر معمولی اعتماد ہے کہ وہ اسے ہی بالکل صحیح اور فطری سمجھتے ہیں اور اگر اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہا جائے تو اس پر فوراً تنگ نظری اور رجعت پسندی کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ کی اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ جو خود بڑے محدود نقطۂ نظر کے حامل ہیں، جن کی آنکھوں پر تعصبات کی پٹیاں بندھی رہتی ہیں اور جو اپنی رائے کے برعکس کوئی رائے سننا تک گوارا نہیں کرتے، جو اپنے اوہام اور خواہشات کو ہی حق سمجھ بیٹھے ہیں وہ دوسرے لوگوں پر تنگ نظری اور تعصب کا بلاتکلف الزام لگاتے ہیں۔

ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم فکر و نظر کی ان دو بنیادی لغزشوں کے عملی مضرات پر پوری تفصیل سے بحث کریں۔ یہاں ہم بطور مثال صرف ایک دو مسائل کو لیکر اس حقیقت کی وضاحت کریں گے کہ ان لغزشوں نے انسانیت کو کن غلط راہوں پر ڈال دیا ہے۔

مالتھس نے انسانی آبادی کی رفتارِ ترقی اور خوراک کی رفتارِ ترقی کا مطالعہ کر کے اس بات کا اندازہ لگایا کہ آبادی خوراک کے مقابلہ میں بڑی سرعت کے ساتھ بڑھتی ہے۔ ہو سکتا کہ یہ مشاہدہ ایک خاص دور میں بعض مخصوص حالات کے اندر کسی حد تک درست ہی ہو لیکن اسی مشاہدے کو حرفِ آخر سمجھ کر اس پر باقاعدہ ایک فلسفہ مرتب کر دیا گیا۔ فطرت کے بارے میں اس غلط تخیل کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کی گئی کہ قدرت معاذ اللہ بڑی بخیل اور ظالم ہے۔ اور وہ انسانوں کے ساتھ ایک شرمناک کھیل رہی ہے۔ وہ خود آبادی کو خوراک

کے مقابلے میں زیادہ سرعت کے ساتھ بڑھاتی ہے اور پھر جب دونوں میں تفاوت ہو جاتا ہے تو ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم عناں کرنے کے لیے زلزلوں کے ذریعہ، بھوک اور بیماری کے ذریعہ جنگ و جدال اور قتل و غارت کے ذریعہ انسانوں کی تعداد میں کمی کرتی ہے۔ اب اگر انسانیت قدرت کے اس عذاب سے بچنے کی تمنی ہے تو اُس کی ایک ہی صورت ہے کہ آبادی کو خود روک دیا جائے۔

لیکن آبادی جس طرح سے بڑھتی ہے وہ انسانی جبلت کا فطری تقاضا ہے جس سے انسان محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس بنا پر مغربی مفکرین نے فیصلہ کیا کہ انسان اس فطری وظیفہ کو تو سرانجام دیتا رہے لیکن بعض ایسی مصنوعی تدابیر اختیار کر لی جائیں جن کی مدد سے وہ پیدائش اولاد کے انجام بد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔

کثرت آبادی کا یہ بالکل "سائنٹفک" تجزیہ ہے اور اس کے بُرے نتائج سے بچنے کا اہلِ مغرب کے نزدیک یہی ایک مؤثر ذریعہ ہے جس کو "عقل و فکر" کی پوری پوری تائید حاصل ہے اس تجزیہ کے علاوہ یا اس تجویز کے ماسوا جو کچھ کہا یا سنا جائے وہ اُن کی نگاہ میں سراسر لغویت اور جہالت ہے۔ حق یہی ہے اور باقی سب باطل افکار ہیں جنہیں کم علم اور جاہل لوگ پیش کرتے ہیں۔

ضبطِ تولید کا یہ نظریہ تہذیبِ جدید کا ایک ایسا بنیادی فلسفہ ہے جسے سائنسدانوں نے اس تہذیب کے لیے بطور اساس فراہم کیا ہے۔ اس نظریہ کے اثرات اس تہذیب کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ یورپ نے جو نیا فلسفۂ اخلاق مرتب کیا ہے اس کے لیے بھی اس نظریہ نے ایک زبردست علمی بنیاد مہیا کی ہے۔ لیکن اگر آپ ذرا اس سائنٹفک نظریہ کی گہرائی میں اتر کر مطالعہ کریں تو آپ کو فوراً محسوس ہو گا کہ علّت و معلول کا یہ "سائنٹفک نظام" بالکل ناقص ہے۔ آبادی اور غذا کے بالکل سطحی مطالعہ سے بعض ایسے نتائج مستنبط کیے گئے

ہیں جنہیں تاریخ نے یکسر جھٹلا دیا ہے لیکن سائنس کے پرستاروں کی جسارت اور اپنے توہمات پر بے جا اعتماد اور سندان حقائق کے قبول کرنے میں مانع ہے وہ اس نظریہ کی واضح غلطیوں کے سامنے آجانے کے بعد بھی ابھی تک اپنی ہٹ پر قائم ہیں اور بڑی بے باکی کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ انسانیت کے معاشی دکھوں کا مداوا صرف ضبطِ تولید میں ہے۔

اب آپ ایک نظر میں یہ دیکھیے کہ یہ "سائنٹفک نظریہ" کتنا سطحی اور انسانی زندگی کے کتنے غلط مطالعہ اور ناقص مشاہدہ پر مبنی ہے۔

تاریخ نے سب سے پہلے تو اس حقیقت کو ہی جھٹلا کر کہ آبادی خوراک کے مقابلہ میں زیادہ سرعت کے ساتھ بڑھتی ہے اس کی سب سے اہم بنیاد کو منہدم کر دیا ہے۔ اس ضمن میں بعض مغربی ماہرین فن کی آراء ملاحظہ ہوں:

"مالتھس اس رفتار کو صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر رہا جس کے مطابق پیدائشِ دولت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔" (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا)

"معاشی ترقی کے حقائق نے مالتھس کے بنیادی فلسفہ کو باطل ثابت کر دیا ہے۔ ... دنیا میں نئے نئے قطعاتِ ارضی کی تلاش سے، زراعت کے جدید طریقوں سے انسانیت کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ وسائل رزق میں مزید اضافہ کر سکے اور زیادہ آبادی کو بہتر معیارِ زیست پر زندہ رہنے کے قابل بنا دے۔"

(ایرک رول، ہسٹری آف اکنامک تھاٹ)

"تاریخ نے مالتھس کے پیش کردہ حقائق کی تصدیق نہیں کی۔ کوئی ملک بھی ایسا نہیں جس کے متعلق وثوق سے کہا جا سکے کہ وہ کثرتِ آبادی کا شکار ہے۔ بعض ممالک تو ایسے ہیں، مثلاً فرانس جہاں آبادی میں بہت معمولی اضافہ ہوا ہے۔ بعض میں آبادی فی الواقع کافی حد تک بڑھی ہے لیکن دنیا کا کوئی ملک بھی ایسا نہیں جہاں آبادی میں

اضافہ کا تناسب دولت میں اضافہ کے تناسب سے تجاوز کر گیا ہو۔"

(ہسٹری آف اکنامک ڈاکٹرائنز، چارلس لسٹ)

"کثرتِ آبادی کے متعلق مالتھس کے جو مشاہدات تھے، اُن کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ غلط ثابت ہوئے ہیں۔ اس نے جس وقت اہلِ یورپ کے افلاس کو دیکھ کر لوگوں کو ضبطِ تولید کا مشورہ دیا، وہ اور حالات تھے۔ وہ صنعتی انقلاب اور امریکہ کی زرعی پیداوار کا اندازہ کر سکتا تھا۔ مالتھس کے بعد جن لوگوں نے اس نظریہ کا پرچار کیا انہوں نے بھی ایک دو ممالک کے افلاس سے وقتی تاثر قبول کیا وہ سائنس کی ترقی اور اس کے ممکنات، اور حالات کے تغیر و تبدل کا پوری طرح اندازہ کرنے سے قاصر رہے۔" ٹائم۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۶۰ء

امریکہ کا یہی میگزین ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں جو زمینیں بیکار پڑی ہوئی ہیں انہیں اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے اور صرف اُن زمینوں سے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا جائے جو اس وقت زیرِ کاشت ہیں تو تب بھی خوراک میں حیرت انگیز اضافہ ہو سکتا ہے:

"دنیا میں اس وقت جو زمینیں زیرِ کاشت ہیں اگر انہیں ہی ہالینڈ کے کسانوں کی سی مستعدی اور ہنرمندی کے ساتھ کاشت کیا جائے تو برطانوی معیشت دان کولن کلارک کے اندازہ کے مطابق، خوراک کی پیداوار ۲۹ بلین افراد (یعنی موجودہ آبادی سے دس گنا) کی متحمل ہو سکتی ہے۔"

یہ ہے ضبطِ تولید کی سائنٹیفک بنیاد کے متعلق خود مغربی مفکرین کی آرا لیکن یہ معاملہ کا صرف ایک پہلو ہے اس کے دوسرے پہلو اس سے بھی زیادہ کمزور اور انسانیت سوز ہیں۔ ضبطِ تولید کی وجہ سے جائز اولاد کی پیدائش میں تو یقیناً کمی ہو گئی لیکن اس سے دنیائے مغرب

میں صنفی انارکی کا ایک ایسا خوفناک طوفان اٹھا جس کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونے کے بعد عفت و عصمت کے قلعے مسمار ہوئے۔ انسانیت نے پاکدامنی اور پاکبازی کو دورِ جہالت کی یادگار سمجھتے ہوئے تیاگ دیا اور اس طرح مہذب و متمدن انسان نے صنفی جبلت کے بارے میں ایک ایسی روش اختیار کی کہ اگر اسے جانوروں کی طرف بھی منسوب کیا جاتے تو وہ بھی شرم سے اپنا سر جھکا لیں۔ آزاد شہوت رانی سوسائٹی کا ایک فیشن بن گیا، جگہ جگہ اسقاطِ حمل کے لیے کلینک قائم ہوئے اور ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت معاشرہ میں بے حیائی اور فحاشی کو پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ ضبطِ ولادت کا فلسفہ اگر ایک طرف معاشی معیار کو کسی حد تک بلند کرنے کا ذریعہ ثابت ہوا تو دوسری طرف اسی فلسفہ نے لوگوں کے دل و دماغ میں خود غرضی کے بیج بوئے، خاندانی ذمہ داریوں سے بچنے اور عورت کو محض جنسی خواہش کا آلۂ کار بنانے کا درس دیا، اخلاق، شرم و حیا الغرض وہ ساری اخلاقی قدریں جو انسانیت کا بیش قیمت سرمایہ تھیں وہ اب کم عقلوں اور جاہلوں کا شیوہ قرار پائیں۔ اس سائنٹیفک نظریہ سے یورپ کے اخلاق کس طرح متاثر ہوئے اس کا ہلکا سا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔

"سنہ ۳۰ء - ۱۹۳۸ء کے درمیانی عرصہ میں ہر سال انگلستان میں تقریباً اسی ہزار حرامی بچے پیدا ہوئے۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہاں دس میں سے ایک عورت شادی کے مرحلہ سے پہلے ہی صنفی تعلقات قائم کر لیتی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں بیس سال کی عمر سے کم شادی کرنے والی عورتوں میں ۴۰ فیصد تعداد ایسی عورتوں کی تھی جو نکاح سے پہلے ہی حاملہ ہو چکی تھیں۔"

(سائیکالوجی آف سیکس)

قریب قریب یہی صورتِ حال اہلِ امریکہ کو بھی درپیش ہے۔ مشہور امریکن رسالہ "کارونٹ" کے ایک شمارہ میں چند سال پیشتر لیسٹر ڈیوڈ کا ایک فکر انگیز مضمون شائع ہوا۔ فاضل مضمون نگار

نے دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ امریکہ کی اخلاقی زندگی بڑی سرعت کے ساتھ تباہ ہو رہی ہے۔

"ہر سال لاکھوں امریکن عورتیں۔ جن میں سے بعض شادی شدہ بھی ہیں، اسقاطِ حمل کی کوشش کرتی ہیں۔ اندازہ کے مطابق ان میں ہر سال بارہ لاکھ کو اپنے اس ناپاک مقصد میں کامیابی نصیب ہوتی ہے . . . . اسقاطِ حمل کا یہ قبیح فعل روز بروز ترقی پر ہے . . . . آج سے پہلے معاشرہ میں عام تاثر یہی تھا کہ اس فعل کا ارتکاب بالعموم وہی عورتیں کرتی ہیں جو بدکار ہوں اور اس سے اُن کا مقصد سوائے بدنامی سے بچنے کے اور کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن دورِ جدید میں یہ بات صحیح نہیں۔ اب تو شادی شدہ عورتیں بھی اس میں بلا تکلف ملوث ہوتی رہتی ہیں"۔

ان اخلاقی مفاسد کے علاوہ تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ضبطِ تولید کا فلسفہ قوموں کی تباہی و بربادی کا موجب ہے۔ مثال کے طور پر فرانس کی بربادی میں جتنے بھی عوامل کارفرما ہے ہیں ان میں یہ نظریہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر کالنون ہارمس ورتھ یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ کی آٹھویں جلد میں رقمطراز ہے:

"کوئی نسل یا قوم جو ضبطِ تولید کے ذریعہ آبادی کے اضافہ کو روکتی ہے، جری اور بہادر پڑوسی ممالک کی شکارگاہ بن جاتی ہے۔ فرانس جس نے غور و فکر کے ساتھ آبادی کے تناسب کو وسائل رزق سے بڑھنے نہ دیا بلکہ انہیں متوازن رکھنے کی کوشش کی، اسے جب المانیہ کی یورشوں کا مقابلہ کرنا پڑا، تو سخت ناکامی ہوئی۔ اُس کے پاس ایسے افراد کی کمی تھی جو خالی جگہوں کو جلد از جلد پُر کر سکیں۔ ان حالات کے تحت وہ اس بات پر مجبور ہو گیا کہ وہ اپنے ملک کے دروازے غیر ملکی لوگوں پر بالکل کھول دے تاکہ وہ مرنے والوں کی جگہ سنبھال لیں"۔

ہم تنگ دامانی کی وجہ سے ضبطِ تولید کے صرف ان چند پہلوؤں کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں حالانکہ اس مسئلہ کے بے شمار معاشی، اخلاقی، روحانی اور نفسیاتی پہلو ایسے ہیں جن پر اصحاب بصیرت نے غور وفکر کیا ہے۔ تاریخ نے اس نظریہ کی تائید نہیں کی، معاشیات نے اسے محض ایک بے جا خوف سے تعبیر کیا ہے۔ اخلاق نے اسے دشمنِ انسانیت گردانا ہے لیکن اس کے باوجود اسے دنیا میں قبولِ عام حاصل ہے اور اس کی لغزشوں اور مفاسد کے سامنے آجانے کے بعد بھی ہمارے ذہن اسے رد کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتے کیونکہ سائنس کی بارگاہ سے اسے حق و صداقت کی سند عطا ہو چکی ہے اور یہ سند خواہ کتنی ہی غلط ہو لیکن اس مادہ پرستانہ ماحول میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ البتہ جو کچھ اس کے خلاف کہا جائے، خواہ وہ کتنی ہی وزنی اور مبنی بر انصاف بات ہو وہ سراسر جہالت و گمراہی ہے۔

آپ زندگی کے جس مسئلہ کا بھی مطالعہ کریں گے ہر ایک میں سائنس پرستوں کے اس تعصب اور کم نظری کے واضح اثرات پائیں گے۔ حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں جو ان کے اثرات سے خالی ہو۔ یہاں غلطی سے علت و معلول کے درمیان صرف ایک ہی کڑی فرض کر لی جاتی ہے جسے مادیت نے ترتیب دیا ہے اور اس کے ساتھ اپنے ذہن میں اس باطل خیال کو بھی بٹھا لیا جاتا ہے کہ علت و معلول کے اس رشتے میں مادی رشتے کے علاوہ اور کوئی دوسرا رشتہ ممکن ہی نہیں ہے۔

اسے ہماری بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جائے کہ ہم مسلمانوں نے بھی اب غور و فکر کا یہی مادہ پرستانہ انداز اختیار کر لیا ہے۔ ہمارے سامنے جب کبھی کوئی معاملہ آتا ہے تو ہم بھی مغرب کی پیروی میں صرف اس کے مادی پہلوؤں پر غور کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کے اخلاقی یا روحانی پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے سامنے جب کبھی غربت اور

افلاس کا سوال آیا ہے تو ہر پھر کر ہماری نگاہ ضبطِ تولید پر ہی پڑتی ہے اور اسی کا اندھا دھند پرچار کرنا ہم اپنا فرضِ منصبی سمجھ بیٹھے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہماری اس بیماری کے لیے یہی تریاق ہے۔ ہم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اس غربت اور افلاس کے کچھ غیر مادی پہلو بھی ہیں۔ یہ مسئلہ علت و معلول کی جن زنجیروں سے وابستہ ہے اُس میں کچھ حلقے روحانی اور اخلاقی بھی ہیں۔ اور ان سے جب کبھی صرفِ نظر کر کے معاملے کو صرف مادّی نقطۂ نظر سے سلجھانے کی کوشش کی جائے گی تو وہ بجائے سُلجھنے کے اور اُلجھے گا اور ہماری معاشرتی زندگی میں بھی اُسی طرح کا اختلال اور بگاڑ پیدا ہو گا جس طرح کہ مغربی دنیا میں آج پایا جاتا ہے اور ہماری زندگی مغربی زندگی کی طرح سائنس کی ہوشربا ترقی کے باوجود ہمارے لیے ایک شدید عذاب ہو گی۔

خدا ہمیں اُس منحوس دن سے بچائے جس دن ہماری ایجادات ہی ہمارے لیے تباہی بربادی کا موجب ثابت ہونے لگیں۔

قاعدے اور سیپارے مفت حاصل کیجیے

قرآن مجید کی ترویج و اشاعت کے پیش نظر انجمن حمایت اسلام لاہور نے دس لاکھ قاعدے اور سیپارے صرف لاگت پر فروخت کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اس ضمن میں چند مخیّر حضرات نے انجمن کو مالی امداد بھی مرحمت فرمائی ہے اس لیے اس امدادی رقم کے قاعدے اور سیپارے مفت تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ تمام مساجد، دینی مدارس اور دیگر تبلیغی ادارے اپنے استطاعت نہ رکھنے والے طلبہ کے لیے قاعدہ بغدادی اور قرآن مجید کے سیپارے اوّل تا یازدہم اور تیسواں پارہ مطلوبہ تعداد میں کتب خانہ انجمن حمایت اسلام براندرتھ روڈ، لاہور سے مفت طلب فرما سکتے ہیں۔ تمام درخواستیں، درخواست دہندہ ادارے کے مہتمم اعلیٰ کے دستخط سے موصول ہونی چاہییں۔ جن میں مطلوبہ تعداد کی ضرورت کی تصدیق ہو۔ اور یہ واضح کیا گیا ہو کہ یہ قاعدے اور سیپارے فروخت نہیں کیے جائیں گے۔